اقبال کی قومی شاعری

مصنفہ

امۃ الکریم ایم اے (عثمانیہ)

اقبال کی قومی شاعری

مصنفہ

امۃ الکریم ایم اے (عثمانیہ)

(زیر اہتمام)

غلام رسول صاحب

اشاعت :- جون ۱۹۸۳ء

طباعت :- ڈائمنڈ الیکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد

کتابت :- تاج الدین، چاپل بازار حیدرآباد

ناشر :- غلام رسول صاحب

ملنے کا پتہ :- عثمان پورہ حیدرآباد دکان نمبر ۱۶-۶-۲۸۲/۶

الیاس ٹریڈرس شاہ علی بنڈہ حیدرآباد ۲

قیمت (۶) روپے

ہ

انتساب —

اپنے مشفق و محترم اساتذہ

کے نام

بصد احترام

فہرست

پیش لفظ

آمنۃ الکریم میری شاگرد ہیں۔ ایم۔اے انہوں نے امتیازی حیثیت سے کامیاب کیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ وہ ان طالبات میں سے ہیں جنھیں حقیقی معنوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔ ایم۔اے کرنے کے فوراً بعد وہ سلطان العلوم تقاریب کے سلسلے میں ایک مقالہ سپرد قلم کر چکی ہیں جو بہت جلد شائع ہوگا۔ بڑی محنت اور لگن کے ساتھ انہوں نے کتاب مرتب کرلی۔ اس کتاب کو سلطان العلوم تقاریب کمیٹی شائع کرنے والی ہے۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے اہم موضوع پر لکھنے لگیں یعنی "اقبال کی قومی شاعری"۔ اس موضوع پر بھی ان کی مختصر کتاب مکمل ہوچکی ہے۔ انہوں نے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اس کی تالیف میں بھی بڑی محنت کی ہے۔

اقبال کی شاعری کا کوئی بھی پہلو ہو وہ اتنی گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے کہ کوئی ایک کتاب اس کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتی۔ اقبال کی قومی شاعری پر شاید علیحدہ طور پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت ہے۔ یہ اقبال کی شاعری کے ایک ایسے پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب علمی اور ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔ امتہ الکریم کی محنت، جستجو اور لگن بہر طور قابل تحسین ہے۔ انہوں نے مقدور بھر کوشش کر کے اس موضوع پر مواد اکٹھا کیا ہے۔ اور اس کو سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ خدا کرے آئندہ بھی ان کا یہ ادبی شوق و ذوق قائم رہے اور وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں آگے بڑھتی رہیں۔

ڈاکٹر یوسف سرمست
ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

مورخہ ۸/جون ۱۹۸۳ء

بروز چہارشنبہ

دیباچہ

اقبال کی تخلیقات انسانیت کا ایک عظیم ورثہ ہیں۔ ان کا فن اور فکر باوصف ایک انفرادیت کے مشرق و مغرب کے علمی، شعری اور فلسفیانہ قلزموں سے سیراب ہوکر آیا ہے۔ ان کے لہجہ کا وقار اور انداز فکر ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ انسانیت کی معراج کا وہ نغمۂ لاہوتی ہے جس کی لے میں تعمیر خودی اور آہِ رسا کی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں۔

اقبال کو اپنی قوم کی فتح و نصرت کا ہمیشہ خیال رہا۔ انہوں نے اپنی قوم کو اپنے سوزِ نفس سے نئی زندگی بخشی۔ ان کے نزدیک قوم میں دریا کی سی وسعت ہونی چاہئے۔ انہوں نے اپنے کلام میں اعلیٰ درجہ کے قومی اور روحانی جذبات اور حکمت کے جواہر ریزے بکھیرے ہیں۔ اقبال کی قومی نظموں کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اخوت کے

پھولوں کا ہار گوندھا ہے اور ایک عالمگیر محبت و اتحاد کی بنیاد قائم کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ ایک ایسے نور کی جھلک ہے جس پر ہر پرستار وطن کا سر جھک جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی تمنا تھی کہ دریائے نیل کے ساحل سے کاشغر کی خاک تک سب ایک ہوں۔ لیکن ان کی آرزوؤں کے خواب اب تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے بلکہ سمرقند، بخارہ اور تاشقند جہاں سے اسلامی علوم وفنون کا سرچشمہ بہا تھا کمیونزم کے زیر نگیں ہیں۔ عراق اور شام نے اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر اشتراکی خیالات کو اپنا لیا۔ افغانستان روس کی آغوش میں پناہ گزیں ہوا۔ سعودی عرب، پاکستان اور ایران سے اسلامی دستور کی صدائیں بلند ہوئیں لیکن ہنوز عملی پہلو سے ناآشنا نظر آتی ہیں۔ جو معمار جہاں بننے آئے تھے، جو رازکن نگاں تھے، جو ایشیا کے پاسباں بنائے گئے تھے وہ سوچیں کہ اب وہ کیا ہیں؟ طاؤس ورباب کی دنیا کے فریفتہ ضرور ہیں لیکن شمشیر و سناں کی منزلوں سے قطعاً ناآشنا۔ عصر حاضر کا تقاضہ ہے کہ ہم شاعر مشرق کے کلام کو نہ صرف یہ کہ پڑھیں اور اس کی ادبی نیرنگیوں میں گم ہو جائیں بلکہ ان کی بتائی ہوئی ان راہوں پر گامزن ہو جائیں جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہونچاتی ہیں۔ یعنی صداقت، انصاف اور نیکی کی راہیں جن پر چل کر قومیں ترقی کی معراج پر پہونچ جاتی ہیں۔ اقبال کا مخاطب بالعموم ہندوستانی

اور بالخصوص مسلمان ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو غلامانہ زندگی بسر کرنے سے روکا اور زندہ قوموں کی طرح رہنے کی تلقین کی۔ انہوں نے اپنی قومی شاعری میں جو پیغام دیا وہ سوتوں کو جگانے، غافلوں کو ہوشیار کرنے اور دلوں میں عزم و حوصلہ پیدا کرنے میں بجلی کا سا کام کرتا ہے۔

پیش نظر کتاب میں اقبال کی قومی شاعری کا ایک اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایم-اے (سال آخر) کی تعلیم کے دوران راقمہ نے اپنے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے اقبال کی قومی شاعری کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اس دوران اپنے قابل اور مشفق اساتذہ صاحبان کے معلومات آفریں لیکچرس اور گرانقدر رہنمائی کے علاوہ اس موضوع پر مجھے متعدد کتابوں، مقالوں اور مضامین سے بھی استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ . . . .

جس کی وجہ سے اقبال کی قومی شاعری کے متعلق کافی مواد اکٹھا ہوگیا۔ اپنے بعض اساتذہ اور کرم فرماؤں کے اصرار پر میں اس مقالے کو زیور طبع سے آراستہ کر رہی ہوں۔ یہ کتاب میری ایک طالب علمانہ کوشش ہے اور میں اقبال جیسے بلند پایہ مفکر اور شاعر کے ساتھ مکمل انصاف کرنے کا ادعا نہیں کرسکی۔ اس خصوص میں مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورا

احساس ہے۔

پیش نظر کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں اقبال کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے اور بہ حیثیت شاعر اور مفکر ان کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا باب اقبال کی قومی شاعری سے متعلق ہے۔ آخر میں اقبال کی قومی نظموں کا ایک انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا تعارف ادھورا رہے گا اگر میں اپنے اساتذہ کا شکریہ ادا نہ کروں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں ماہر اقبالیات محترم پروفیسر غلام عمر خاں صاحب صدر شعبہ اردو کی سپاس گزار ہوں جن کے بصیرت افروز لکچرس سے مجھے اقبال کے فکر و فن کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔

میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے تمام اساتذہ کی بھی ممنون ہوں جن سے میں نے ایم۔ اے کی تعلیم کے دوران استفادہ کیا ہے۔

امتہ الکریم

۱۰/جون ۱۹۸۳ء

بمقام عثمان پورہ

باب اوّل

اقبال بہ حیثیت شاعر

اقبالؔ صرف اردو زبان کے ایک عظیم المرتبت شاعر ہی نہیں۔ بلکہ بیسویں صدی عیسوی کے سب سے بڑے شاعر اور مفکر ہیں۔ اقبالؔ کے ہاں مقصد و فن کا توازن اور حسین و جمیل امتزاج ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایک واضح نظام فکر پایا جاتا ہے۔ ابتدائی مشق سخن کے کلام کو چھوڑ کر انکی تمام شاعری اسی نظام فکر کے محور کے اطراف گھومتی ہے۔ انکی یہ فکر عظیم ہی انکی شاعری کی روح ہے۔ اگر ان کا کلام محض رفعت خیال اور بلندئ فکر کا حامل ہوتا اور شاعرانہ محاسن اس میں موجود نہ ہوتے تو شاید انھیں یہ مقبولیت حاصل نہیں ہوتی جو آج ہے۔ بالفاظ دیگر ان کے کلام کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ فکر و خیال کی ندرت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے کلام میں تمام شعری محاسن کو بھی بوتا ہے۔ اس لحاظ سے اُن کا آرٹ بلند ترین آرٹ کہلاتا ہے۔ ان کی شعری نفاست اور سلیقے سے تراشا ہوا

ایک ایسا نگینہ ہے جو اپنے قاری کی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ اقبال کے کلام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ان کے فکر کی گہرائیوں کا عمیق مشاہدہ اور ان کے فن کی نزاکتوں اور باریکیوں کا بہ نظر غائر مطالعہ ضروری ہے۔ ان کے کلام میں شعر و فلسفہ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ محاسن اور وہ صفات جو عظیم شاعری کے لئے ضروری ہیں اقبال کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ اور عظیم شاعری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے دلوں کو مسحور کر لیتی ہے اور زندگی کے مختلف تجربات و واقعات کا ایک نیا مانوس جذبہ پیدا کر دیتی ہے اس جذبہ کی پہچان علامہ اقبال کے اس شعر سے ہو سکتی ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال کبھی والہانہ انداز سے انسانی جذبات کو منعکس کرتے ہیں تو کبھی اپنے افکار عالیہ سے تقدیر کے سربستہ رازوں کو منکشف کرتے ہیں۔ کبھی قافلۂ ہستی کو منزل کی طرف رواں کرتے ہیں اور کبھی اپنے علم پرور اور حکیمانہ مشوروں سے تعلیم دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری اپنے اندر گہرائیاں رکھتی ہے اور ساتھ ہی وسعتیں بھی۔ جس طرح ان کی زندگی میں مشرق و مغرب کے علم و حکمت کا امتزاج ملتا ہے اسی طرح ان کی شاعری میں مشرقی روحانیت اور مغربی علم و حکمت مجتمع نظر آتی ہے۔

اقبال کے دل میں اپنے وطن اور اہلِ وطن سے محبت جاگزیں تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری وطن دوستی اور سامراج دشمنی سے شروع ہوتی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں وہ ہندوستان کی تحریک آزادی سے متاثر ہوئے اور اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں نمایاں حصہ لیا خصوصاً مسلمانانِ ہند کو اپنی پستی اور گمراہی کا احساس دلایا اور ان کے قلوب میں جوشِ عمل کا دریا موجزن کر دیا۔ کوئی مسلمان خواہ وہ کسی بھی خطے یا صوبے کا ہو اس کا دکھ درد اقبالؔ کا اپنا دکھ درد تھا۔ اقبالؔ اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اجتماعی وجدان چاہتے تھے اور اپنے پیغام کے طلسم سے غلام ہندوستانیوں کے دلوں میں زندگی کی لہر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کی مشہور قومی نظمیں 'ہمالہ' 'صدائے درد' 'ترانۂ ہندی' 'نیا شوالہ' 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' وغیرہ ہندوستان کی قومی شاعری کی بے مثال اور زندہ جاوید نظمیں ہیں۔ علامہ اقبالؔ اپنے عہد کے ایک بلند پایہ عالم اور صاحب بصیرت مفکر تھے۔ سفر یورپ کے دوران ان پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ قوم پرستی اور وطنیت کے مغربی تصور نے عالم انسانی کو متعدد چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم کر دیا ہے جو آپس میں برسرپیکار رہتے ہیں۔ اس حقیقت کے منکشف ہوتے ہی اقبالؔ اس نتیجہ پر پہونچے کہ قوم پرستی کا تصور عالم انسانی کے امن کے لئے مستقل خطرہ ہے اس طرح

سفر یورپ کے بعد اقبال کے افکار میں تبدیلی رونما ہوئی جس سے وطن دوستی کی ترغیب ضرور ملتی ہے لیکن وطن پرستی کا جذبہ ایک ذیلی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔

اقبال کی شاعری ایک ایسے نظام فکر کی مظہر ہے جس میں شاعر نے عمل، یقین اور محبت کی معاشرتی اور اخلاقی قدروں کی تعلیم دی ہے اور مشرق و مغرب کی زندگی اور ان کی تہذیب، معیشت اور سیاست کو بے نقاب کر کے ان کی حقیقت کو آشکار کیا ہے ۔ فکر کی انتہائی بلندی کو جذبہ کی انتہائی گہرائی بنا دینے کے معجزے ہی میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کا راز مضمر ہے ۔ چونکہ اقبال کے نظام فکر کا محور و مرکز انسان ہے اسی لئے انہوں نے اپنے افکار کو انسان ہی سے متعلق رکھا ہے ۔ افکار اقبال میں درجہ ذیل تصورات نمایاں اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ۔

تصور خودی، تصور عشق، تصور مرد مومن، تصور فقر، تصور مملکت، تصور تعلیم، تصور فنون لطیفہ، سماج میں عورت کا مقام

ان تصورات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلے حصہ کے تصورات " تصور خودی، تصور عشق، تصور مرد مومن اور تصور فقر، مابعد الطبیعیاتی تصورات (METAPHYSICAL CONCEPTS) کہلائے جاتے ہیں ۔ ان تصورات میں فرد کی شخصیت اور اس کی ماہیت سے بحث ملتی ہے ۔ دوسرے حصہ کے تصورات سماج سے متعلق ہیں اور

(SOCIOLOGICAL CONCEPTS) کہلاتے جاتے ہیں۔ ان میں اقبال کا نظریہ حکومت، تصور تعلیم، تصور فنون لطیفہ اور معاشرے میں عورت کی حیثیت سے متعلق تصورات ملتے ہیں۔ موخرالذکر تصورات میں معاشرے میں انسان کو بہ حیثیت فرد اور جماعت کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیئے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

اقبال کا تصور خودی ایک اہم پُراز معنی اور جامع تصور ہے اس خودی کی روح کو اقبال نے کائنات کے ذرہ ذرہ میں پھونک دیا ہے۔ ان کا تصور خودی درحقیقت عظمت آدم کی شناخت کا دوسرا نام ہے۔ انہوں نے اپنے اس تصور کو سب سے پہلے "اسرارِ خودی" میں پیش کیا ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ کہتے ہیں "اس کا مفہوم محض احساس نفس، یا تعین ذات ہے" ان کے نزدیک جس نے اپنی خودی حاصل نہیں کی وہ خدا کی تلاش نہیں کرسکتا۔ مندرجہ ذیل شعر میں وہ خودی کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

وہ کہتے ہیں کہ زندگی کا اصل محرک اثبات خودی کا جذبہ ہے ؎

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیدارئ کائنات

اقبال نے اپنی قوم میں "خودی" اور کاوش پیہم کا ایک مستقل جذبہ پیدا کرنا چاہا لیکن غلامی کی لعنت میں گرفتار مسلمانوں کو جنبش تک نہ ہوئی اس کے باوجود خودی کے اس متوالے نے بہ بانگ دہل کہا

وقت آنیست کہ آئین دگر تازہ کنیم
لوح دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

خودی کے علاوہ اقبال نے اپنے کلام میں عشق کی اصطلاح بھی بڑی کثرت سے استعمال کی ہے اور اس لفظ کو ایک نیا مفہوم عطا کیا ہے۔ عشق محمدی اقبال کے عناصر عشق میں مقام اولین رکھتا ہے۔ ان کا تصور عشق بڑی وسعت، گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے اور ساتھ ہی معنی خیز بھی ہے۔ ہر انسان بلکہ ہر جاندار کی ساری جد وجہد اور اس کی ساری مساعی کی تہہ میں جو بنیادی جذبہ کارفرما ہے اسے جذبہ حیات یا (LIFE FORCE) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اقبال اسی بنیادی جذبۂ حیات کو عشق کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اقبال روحانیت کو عشق سے موسوم کرتے ہیں جو زندگی میں تخلیقی اور انقلابی قوتیں پیدا کرتی ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ عشق جوہر خودی کو مشتعل (EXPLODE) کرنے کا طریقۂ عمل ثابت ہوتا ہے[۱]۔ اقبال کے نزدیک انسانی مقاصد کی لگن بھی عشق ہے۔ تغیر اور انقلاب کی

---

[۱] اقبال کا تصور عشق۔ از پروفیسر ڈاکٹر غلام عمر خاں

خواہش بھی عشق ہے۔ تہذیب نفس کی تخلیقی استعداد بھی عشق ہے۔ اقبال
کہتے ہیں کہ عشقِ حقیقی سے انسان اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔
وہ عشق کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ!
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

اور ایک جگہ کہتے ہیں ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اقبال کے نزدیک اپنے مقاصد سے عشق اختیار کرنے کے
بعد ہی قوم ترقی کے اعلیٰ مدارج پر گامزن ہو سکتی ہے۔ شاعرِ مشرق نہایت
لطف اور بے تکلفی کے ساتھ اس شعر میں خدا سے مخاطب ہیں۔

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ عشقِ محمدیؐ اقبال کے عناصرِ عشق میں مقام
اولین رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مردِ مومن یا انسانِ کامل کا تصور
سرورِ کائنات رسولِ اکرم حضرت محمد مصطفےٰؐ کی ذات بابرکات کی تمثیل

سے کی پیش کیا ہے۔ اقبال کا نصب العین یہ ہے کہ انسان وہ حسین کی شخصیت میں عشق اور خودی باہم ایک ذات ہو کر معراج کمال تک رسائی حاصل کریں حسن کی ذات میں جمالی اور جلالی صفات موجود ہوں۔ اقبال کی پاکیزہ نگاہوں میں اسی فخر موجوداتؐ محسنِ انسانیتؐ کا تصور اور دل میں اسی آقائے نامدارؐ کی محبت بدرجہ اتم موجود تھی اقبال چاہتے تھے کہ امت محمدیہ بھی اپنے آقائے دوجہاںؐ کے انہیں اوصاف سے متصف ہو اور مردِ مومن انسانیت کا اکمل نمونہ ہو جو دنیا کا رہبر بھی ہو اور رفیق بھی۔ سلطان بھی ہو اور خادم بھی ؎

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○

ترجمہ:۔ بے شک وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور وہ شخص ناکام رہا جس نے اس کو گناہوں میں دبایا۔

(ع پارہ عم (۳۰) سورہ الشمس)

فرمانِ مصطفویؐ ہے۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ (فقیری پر مجھے فخر ہے)

قرآن کریم کی اس آیت پاک اور اس حدیث شریف کے نقوش پر ہی اقبال نے اپنے تصور فقر کی بنیاد رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "فقر" اقبال

کے نظام فکر میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں فقر کیا ہے اور کیا قوت رکھتا ہے اقبال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

چیست فقر اے بندگان آب و گل ؟
یک نگاہ راہ بیں ایک زندہ دل

اقبال کے نزدیک بھی فقر' در اصل دل اور نظر کی عفت اور طہارت سے عبارت ہے۔ اسلام کے تصور فقر میں دو عناصر کا امتزاج ضروری ہے ایک مادی قوتوں کی تسخیر اور دوسرے مادی نعمتوں کو ثانوی اہمیت دینا اور انھیں کم نگاہی سے دیکھنا۔ اقبال نے اپنے کلام میں فقر کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اسلام کا یہی تصور ہے۔

اقبال کے کلام سے مملکت یا سیاست سے متعلق بھی ان کے تصورات ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سیاسی نظریات کی بنیاد مذہب اور اخلاقیات پر رکھتے ہیں۔ فکر اقبال کی تمام کاوشیں مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ایک ہی مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں اور یہ مرکز ہے ایک مثالی مملکت اسلامی کا تصور ـــــ یعنی آج سے چودہ سو سال پہلے شہنشاہ دو جہاں حضرت محمد مصطفےٰؐ کے عہد کا سیاسی نظام اقبال نے اپنے نظریہ حکومت میں اسی مثالی مملکت اسلامی کے تصور کو واضح کیا ہے۔ ان کے تصور مملکت کے چار بنیادی ستون ہیں' فقر' خود شناسی (جو خودی سے موسوم ہے) ایمان اور سخت کوشی ـ اسلام کے بنیادی تصورات میں ایک ایسا خیالی

معاشرہ یا سماج پوشیدہ ہے جس میں ساری دنیا کے انسان خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی ' ان کا تعلق کسی علاقہ یا کسی رنگ و نسل سے ہو سب کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع حاصل رہیں ۔ اقبال کے نزدیک نوع انسانی کی فلاح و بہبود اسی قسم کے سیاسی نظام میں مضمر ہے ۔ اسلام کے نقطہ نظر سے یہ سیاسی نظام عدل و انصاف پر مبنی ہے جسے اقبال حکومت الٰہی سے منسوب کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادی وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال کے کلام سے ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق تصورات بھی عیاں ہوتے ہیں ۔ تعلیم و تربیت کے تعلق سے اقبال کے خیالات عہد حاضر کے ایک اور عظیم مفکر نیتشے کے خیالات سے ہم آہنگ ہیں ان کے خیال میں تعلیم و تربیت کے سلسلے میں سب سے اہم ....
..... FACTOR یا عامل معلم کی شخصیت ہے ۔ معلم سے اقبال کی مراد وہ عظیم انسان ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر حکیمانہ نظر رکھتا ہے اور

ایک زبردست مقناطیسی قوت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی مثالی معلم کے لئے اقبال نے "مردِ حق" یا "مردِ مومن" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ایک عظیم معلم کی صحبت اقبال کے الفاظ میں اس کی نگاہِ غلط انداز ہے

تربیت دل کی اگر مدنظر ہے تجھ کو
مردِ مومن کی نگاہِ غلط انداز ہے بس

عام انسانی صفتوں میں عظیم انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ موجودہ کالجوں کے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا ہے

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

یہاں طوفان سے مراد ایک عظیم انسان کی صحبت ہے جو دوسرے انسانوں کے قلوب کو مسخر کر کے انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اقبال کا نظریۂ تعلیم محض تصوراتی نہیں بلکہ اصلاحی تعلیمات ہی پر مبنی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں جدید مغربی تعلیم پر سخت اعتراض کیا ہے۔ ان اعتراضات کی بنیاد یہی ہے کہ یہ تعلیم انسانی شخصیت میں وہ حرارت، گرمی، ولولہ اور حوصلہ پیدا نہیں کر سکتی جو ایک عظیم معلم کی شخصیت کی بدولت انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اقبال کے نزدیک جدید مغربی تعلیم انسانی ذہن کی تربیت اور نشو و نما تو یقیناً کرتی

ہے لیکن وہ انسانی قلب کو جو انسانی حوصلوں، تمناؤں اور عزائم کا مرکز ہے بالکلیہ نظر انداز کر دیتی ہے۔

فنون لطیفہ کے متعلق اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ عظیم فن کار وہ ہے جو اپنے فن کے ذریعہ انسان کے قلب وذہن میں ایک مستقل کیفیتِ حسن پیدا کر دے۔ فنون لطیفہ کے متعلق بھی اقبال اور جرمن مفکر نیتشے کے خیالات میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں کے نزدیک عظیم فن کار اپنے مخاطب کے دل و دماغ میں ایک مستقل درد، اضطراب اور تڑپ پیدا کرتا ہے جو اس کی زندگی کو متاثر کرنے بلکہ اس کی تقدیر کو بدل دینے کا باعث ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک چھوٹے اور ادنیٰ فن کار انسانی جسم میں ہیجان پیدا کرتے ہیں جبکہ عظیم فن کار انسان کی روح کو ایک مستقل ہیجان و اضطراب سے آشنا کرتے ہیں۔

ان کے نظریہ کے مطابق ایسا آرٹ افراد اور قوموں کے حق میں صحت مند ثابت ہوتا ہے جو خواب آور کیفیات کے بجائے اعلیٰ حوصلوں اور اعلیٰ عزائم کی تقلید کا باعث ہو۔ صحت مند اور اعلیٰ آرٹ کی مثال اقبال کے نزدیک رومی کے کلام میں ملتی ہے۔ وہ رومی کو ایک نصب العینی فن کار (IDEAL) تصور کرتے ہیں۔

اقبال نے اپنے کلام میں معاشرے میں عورت کے مقام کو متعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا وجود کائنات

ی تصویر میں رنگ بھرنے کے لئے ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

ان کا یہ نقطہ نظر بالکلیہ اسلامی نظریہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ اقبال عورت کو اجتماعی خودی کا ضامن ٹھہراتے ہیں اور اس کو لذت تخلیق کا پیکر اور سرمایہ ملّت کی نگہدار کہتے ہیں۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی سیرت کو عورتوں کے لئے بطور نصب العین پیش کرتے ہیں۔ عورت کے لئے تعلیم کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں لیکن وہ ایسی تعلیم کے سخت مخالف ہیں جو کسی انسان کو مذہب سے دور کردے۔ یورپ عورت کو جو بے معنی آزادی دے رہا ہے اس سے اقبال سخت اختلاف کرتے ہیں اور ملّت کے لئے اس تقلید کو خطرناک سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آزادی سے ہستی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ چنانچہ "عورت اور تعلیم" میں وہ لکھتے ہیں ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انسان کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اقبال مرد کو عورت پر برتری دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوم اور ملت کے مردوں کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت کریں۔

ان کے خیال میں جس قوم نے عورت کی حفاظت کو اپنا فریضہ نہیں بنایا اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے عروج کا آفتاب ادبار کے اندھیرے میں چھپ گیا ؎

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اپنی بے نظیر اور بے مثال فنی مہارت اور منفرد فکری عظمت کی بناء پر اقبال کو اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ چونکہ شعر و ادب کی بنیاد زبان ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر عظیم شاعر زبان پر قدرت رکھتا ہو ــــ اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال کو اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ روزمرہ، محاورہ اور الفاظ و تراکیب کو صحیح طور پر استعمال کرنے میں وہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اقبال فن کی مہمیز سے اپنے ہمزبان سست عناصر کو منزل مقصود کی جانب تیز گام دیکھنے کے متمنی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندستانیوں کے خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کئے اور انھیں حرکت و عمل اور جد و جہد کرنے کی تلقین کی ان کے اسلاف کے کارنامے بتلا کر ان کے حوصلے بلند کئے۔ انھیں بتلایا کہ

ہم بلا خوف و خطر ملک کو انگریزوں سے آزاد کرواسکتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں انگریز راج اور تہذیب و تمدن پر کاری ضرب لگائی۔ اس طرح غیر منقسم ہندوستان کی تحریک آزادی میں ان کی شاعری کا بڑا حصہ ہے اردو کے اس مایہ ناز شاعر نے اپنی زندگی قوم کو بیدار کرنے کے لیئے وقف کر دی۔ اپنی قوم کو صداقت، انصاف اور نیکی کی یہ نور راہیں بتلائیں جن پر چل کر قومیں بام عروج پر پہونچ جاتی ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو عشق رسولؐ کا درس دیا تاکہ اس عشق کی بدولت ان میں طاقت پیدا ہوجائے اور وہ آئندہ زمانے میں کامیاب وکامران ہوسکیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں اپنے ہم وطنوں کو خاص طور پر مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی شان وشوکت واپس لینے کے طریقے سکھلائے۔ اپنی قومی شاعری ہی کے ذریعہ سفر یورپ کے بعد وطن پرستی کے محدود نظریہ سے اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں نفرت پیدا کی اور وطن دوستی کے وسیع نظریہ کی طرف انھیں راغب کیا۔

اقبال کا کلام بہ ظاہر خشک نظر آتا ہے لیکن بہ نظر غائر مطالعہ کے بعد اس میں شاعر کے خون جگر کی جھلک نظر آتی ہے اور ایک ایسی آگ محسوس ہوتی ہے جس کی تپش اپنے اطراف واکناف کو محیط کئے ہوئے ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری بے انتہا حسین اور دلکش ہے وہ حسن جو اردو شاعری میں پہلے نہیں تھا اقبال نے اس میں سیلاب کا بہاؤ، آبشاروں کی روانی، شیریں بیانی، درد اور سوز پیدا کیا۔ ایک ایک حرف میں رنگینیاں بکھیر دیں۔ ان کی

شاعری میں تغزل بھی ہے اور ترنم بھی۔ شوکت الفاظ بھی ہے اور چست بندشیں بھی۔ خیالات کی وسعت بھی ہے اور سخن کی پاکیزگی بھی۔ واردات قلبی کی جھلک بھی ہے اور لفظ لفظ میں فلسفہ حیات بھی مضمر ہے۔ انہوں نے داغ کی زبان، غالب کا فلسفہ حالی اور شبلی کی قومیت کو اپنی شاعری میں سمو کر ایک نیا آہنگ اور ایک نیا اور منفرد رنگ پیدا کیا۔ اس طرح اردو شاعری میں اقبال کی شاعری ایک نمایاں ممتاز اور اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ اقبال نیکی، صداقت اور انصاف جیسے اعلیٰ اقدار کے ترجمان اور پیغامبر ہیں۔ وہ ایک ایسے مفکر اور شاعر ہیں جنھوں نے اپنے مخصوص افکار کے ذریعہ عالم انسانی کو سوچنے پر مجبور کیا۔ ان کے تمام افکار اسلامی نقطہ نظر کے ترجمان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اثر آفرینی بطرز احسن موجود ہے۔ اسی اثر آفرینی کی وجہ سے ان کا کلام بالخصوص پیغام انسان کے دل کو مسخر کر لیتا ہے اور اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اس طرح اقبال اپنی قوم کو اپنا پیغام پہونچانے میں کامیاب رہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک شاعر سے زیادہ ایک پیغامبر کی حیثیت سے قوم کے سامنے آتے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اقبال صرف اردو زبان کے ایک عظیم المرتبت شاعر ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی عیسوی کے سب سے بڑے شاعر اور مفکر ہیں۔

باب دوم

اقبال کی قومی شاعری

اقبال کی قومی شاعری پر بحث کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کے تصور کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے۔ عام الفاظ میں قوم ایک ایسے معاشرے یا سماج کو کہتے ہیں جس میں تہذیبی و سیاسی وحدت پائی جائے۔ جدید قومیت کا تصور جو دراصل یورپ کا پیدا کردہ ہے قومیت کی تعمیر کے لئے چند متعین شرائط پیش کرتا ہے۔

قوم پرستی کا مغربی تصور

قوم پرستی یا (NATIONALISM) محض اپنی قوم سے دوستی یا محبت کے جذبہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مغربی نظریہ سیاست ہے جو گذشتہ ڈیڑھ صدی سے مغربی ممالک میں نشو نما پا رہا ہے اور رفتہ رفتہ ایشیائی اور افریقی

قومیں بھی اسی نظریہ پر کاربند ہوتی جارہی ہیں ۔ قوم پرستی سے مراد یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ جس ملک کا باشندہ ہے یعنی جس مخصوص جغرافیائی خطہ میں رہتا ہے اس ملک کی فلاح و بہبود کو اپنی زندگی کی تمام جدو جہد کا آخری نصب العین قرار دے ۔ کوئی انسان خواہ وہ ایک مزدور ہو یا بڑا سائنس داں، سیاست داں ہو یا ماہر نظم و نسق اس کی ساری کوششوں کا منتہا یہ ہونا چاہیئے کہ اس مخصوص خطہ ارض کو فائدہ پہونچے جس کا وہ باشندہ ہے ۔ چنانچہ اسی نظریہ کے زیر اثر مغربی قوموں کا نعرہ کچھ اس نوعیت کا ہو گیا ہے ۔ جیسے جرمنی میں بسنے والے جرمن کہلائیں گے اور ان کا نعرہ ہوگا ۔ . . . .

. . . "ALL FOR GERMANY" یعنی وہ جو کچھ کریں گے وہ صرف جرمنی کے حق میں ہوگا ۔ اسی طرح اہل فرانس، فرانسیسی کہلاتے ہیں اور وہ "ALL FOR FRANCE" کو اپنا "MOTTO" قرار دیتے ہیں ۔ اٹلی کے حدود میں رہنے والے "ALL FOR ITALY" کو اپنا نصب العین تسلیم کرتے ہیں ۔ یعنی ان کا نصب العین صرف اپنی قوم اور وطن کی فلاح و بہبود ہوتا ہے ۔ آگے چل کر قومیت کے اسی تصور نے ایک ایسی شکل اختیار کرلی جس میں ایک قوم دوسری اقوام کی حریف اور مدِ مقابل بن کر ابھرنے لگی ۔ اپنی قوم کی فلاح و بہبود

یح دینے کا رجحان دوسری اقوام اور انسانوں کی فلاح و بہبود کو نظرانداز
نے بلکہ ضرورت ہو تو اس کو تباہ کر دینے کے رجحان میں تبدیل
نے لگا۔ اور مغربی ممالک کے لوگ اپنے نصب العین کی خاطر
سری قوم کے انسانوں کا خون بہانا بھی پڑے تو اسے قومی نقطہ نظر
ے نیکی تصور کرنے لگے ــــ قومیت کا یہ انتہا پسندانہ مغربی تصور
رب کے دوسرے افکار و نظریات کی طرح مشرقی اقوام کے ذہنوں میں
دھیرے دھیرے سرایت کرنے لگا۔

اقبال نے جب ۱۹۰۵ء میں یورپ کا سفر کیا اور قومیت
اس انتہا پسندانہ مغربی تصور کا قریب سے مشاہدہ کیا تو ان کے
ار میں تبدیلی اور وسعت پیدا ہوئی اور انہوں نے اس نظریہ کو
ع انسانی کے لئے مہلک قرار دیا۔ اقبال شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی
است داں بھی تھے اور نباض فطرت بھی۔ صاحب علم بھی تھے
صاحب نظر بھی۔ واقف اسرار مشرق بھی تھے اور دانائے
وز مغرب بھی۔ شاعر وطن بھی تھے اور شاعر عالم انسانیت
۔ اقبال حیات انسانی اور اس کے مسائل سے گہری دلچسپی اور
ستگی رکھتے تھے۔ انسان کی ذات سے یہ تعلق خاطر وطن اور آزادی
بارے میں ان کے رویہ پر بھی اثر انداز ہوتا رہا۔ اقبال کا آئیڈیل
لام تھا اور انقلاب ان کا پیغام۔ واضح ہو کہ انقلاب کی پہلی منزل

اپنے وطن سے محبت اور وطنیت کا احساس ہے۔ اقبال کو اپنے وطن ہندوستان سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ وہ ایک سچے ہندوستانی اور حقیقی محب وطن تھے۔ ان کا دل محبت و عقیدت کا سرچشمہ اور سوز و درد مندی سے معمور تھا۔ اپنی آفاقیت، بین قومیت اور گہری مذہبیت کے باوجود وہ ہندوستان کی فلاح و بہبود اور اس کی مسرت و خوش حالی کے دل سے خواہاں اور حتی الامکان حد تک کوشاں رہے۔ ان کے کلام پر ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہے۔ ان کی متعدد نظمیں اس جذبہ کا اظہار کرتی ہیں۔ ۱۹۰۵ء سے قبل اقبال نے حب وطن اور قومی اتحاد و یکجہتی کا بلند آہنگی سے پرچار کیا۔ انھیں اپنے وطن کی غلامی کا شدید احساس تھا۔ ان کے خیال میں آزادی کسی ملک کے جغرافیائی حدود یا محض نقشے کا نام نہیں اور نہ ہی حکمرانی کا نام ہے بلکہ یہ تو ایک ایسا جذبہ ہے جو ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ آزادی ایک ذہنی، قلبی اور روحانی رشتہ ہے جو کسی قوم کے مابین ہوتا ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ آزادی کے حصول کے لئے قوم کے مردہ دلوں میں سوز و گداز، غلامی سے نفرت اور آزادی سے محبت جاگزیں کریں۔ ہندوستان کی غلامی کے تصور سے اقبال پر ندامت و شرمندگی کی جو کیفیات طاری ہوتی تھیں وہ ان کے کلام سے آشکار ہیں۔ ان کے خیال میں شاعر قوم کے دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کسی قوم میں اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں تو وہ قوم

اقبال کے خیال کے مطابق مٹی کے ڈھیر کی مانند ہے۔ ان کے نزدیک شاعر کے فن میں وہ جادو ہونا چاہیئے جو سوتی ہوئی قوم کو جگا دے اس کے اندر زندگی کی حرکت پیدا کر دے۔ جمود کو توڑ دے اور قوم کو ترقی و خوشحالی کے اعلیٰ مدارج پہ پہونچا دے۔ یہ قول راسخ ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری"۔ لیکن جس طرح اور جس انداز سے شاعر مشرق اقبال کے کلام پہ یہ بات صادق آتی ہے اس کی مثال نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ اقبال کو علم غیب حاصل تھا لیکن اس امر سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ بعض آنے والے واقعات کی بھی انہوں نے اپنے اشعار میں ترجمانی کی ہے۔

اقبال کی قومی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک (۲) ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۸ء تک۔

پہلا دور اقبال کی قومی شاعری کا پہلا دور کالج کے زمانۂ طالب علمی یعنی ۱۸۹۹ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۰۵ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ عرصہ ہے جس کے دوران اقبال نے اردو ادب کو قومی اور وطنی شاعری کا بہترین سرمایہ دیا۔ ایک روشن خیال اور صاحب فکر نوجوان کی حیثیت سے اقبال مغربی تصورات سے متاثر ہوئے تھے۔ حبِ وطن، قومی اتحاد اور بیرونی سامراج کے خلاف جدوجہد کے

جذبات نے ان کے افکار میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اقبال کی قومی شاعری کا یہ دور وہ زمانہ ہے جبکہ انڈین نیشنل کانگریس (INDIAN NATIONAL CONGRESS) کی تحریک ابھی اپنے عالم طفولیت سے گزر رہی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ کانگریس کے اس دور کو جو ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء کے عرصہ پر مشتمل ہے کانگریس کی تاریخ میں (THE ERA OF THREE PS) سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی (PRAYER PETITION & PROTEST) کا دور۔ بالفاظ دیگر "دعاؤں، التجاؤں اور احتجاج کا عہد" اور اقبال کی قومی شاعری کا پہلا دور بھی جو ۱۹۰۵ء پر ختم ہوتا ہے اسی عرصہ پر مشتمل ہے۔

"ہمالہ" اقبال کی پہلی قومی نظم ہے جو ان کے پہلے مجموعہ کلام "بانگ درا" میں شامل ہے۔ یہ نظم ایک وطن پرست انسان کی مردہ حسیات کو زندہ کرنے کے لئے بھتی رو کا کام دیتی ہے۔ اقبال نے یہ نظم لاہور کے ایک ادبی جلسہ میں سنائی تھی۔ یہ پہلے ۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" کی پہلی اشاعت میں شایع ہوئی۔ اس نظم نے ہندوستانی شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ یہ نظم شاعر کے قلب کا ایک گہرا نفسیاتی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے وطن پر اغیار کا قبضہ ہو چکا ہے اور وہ خود اس غلامی کی گھٹی ہوئی فضا میں

سانس لے رہا ہے۔ اس کے ملک ہندوستان کی تاریخی عظمت ایک دفتر پارینہ ہو چکی ہے۔ قدم قدم پر اسے ایسے مواقع و حوادث پیش آ رہے ہیں جو برابر اپنی غلامی اور ابنائے وطن کی پستی کی یاد دلائے جاتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے ہمالہ کا یہ سلسلہ ہائے کوہ ہندوستان کی قدامت، عظمت و رفعت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لئے اقبال اس نظم میں ہمالہ کی وسعت اور اس کی رفعت و بلندی سے مخاطب ہیں[۵]

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اس طرح انہوں نے ہمالہ کی قدامت، وسعت اور اس کے قدرتی حسن کی فطری دلکشی کے پس منظر میں وطن کی جغرافی محبت کے جذبے کو نمایاں کیا ہے۔ اس نظم میں خیالات انگریزی ہیں۔ اسالیب بیان اور تراکیب الفاظ دونوں میں انگریزی ادب کا عکس نمایاں ہے اور زبان پر فارسی رنگ غالب ہے۔ اس میں شاعر کا تخیل بے انتہا حسین ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی روح کو وطن کے اس منظر سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ خیالات کی دلکشی اور رعنائی شاعر کے مصورانہ کمال کی غمازی کر رہی ہیں۔ اقبال نے نہایت موزوں الفاظ کا انتخاب کیا ہے جس کی وجہ سے الفاظ قوس وقزح کی طرح رنگین اور دلکش معلوم ہوتے ہیں۔

اس نظم میں منظر کشی اپنی حدوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں وطن پرستی کے جذبات بطرز احسن موجود ہیں۔ جذبۂ حبِ وطن ہی کی وجہ سے شاعر اس کا رتبہ کوہِ سینا سے بھی بڑھا دیتا ہے ؎

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

آگے چل کر شاعر کوہِ ہمالہ کو ہندوستان کی حفظ و اماں کا پاسباں قرار دیتا ہے اور ساتھ ہی اسے "دیوارِ ہندوستان" کہتا ہے جس کی وجہ سے اہلِ ہند دوسری اقوام کے حملوں سے محفوظ ہیں ؎

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو

اسی بند کے ایک شعر میں اقبال ہمالہ کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کو دستارِ فضیلت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح اس نظم کا ہر شعر شاعر کے جذبۂ حب الوطنی کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ جب ہمالہ پر جمی ہوئی برف آفتاب کی کرنیں پڑنے سے چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو شاعر اس کی چمک کو ہمالہ کی خندہ زنی یعنی مسکراہٹ کہتا ہے۔ جو آفتاب کی گرمی سے پگھلنے کے بجائے بدستور اپنی چمک اور بہار دکھا رہی ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ برف سورج کی حرارت اور حدت

کا مذاق اُڑا رہی ہے ؎

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

اسی نظم کا ایک اور بند ہے ؎

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تیری آواز کو

یہ بند اقبال کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت منظر نگاری کا مظہر ہے لیکن ان کے کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ منظر نگاری کو محض منظر نگاری کی خاطر نہیں برتتے بلکہ اس کے پس منظر میں کسی دور رس فلسفیانہ نقطہ نظر کا اظہار ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مذکورہ بند کے اس شعر میں ان کے اس نقطۂ نظر کی ترجمانی ملتی ہے ؎

آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

"شاہدِ قدرت" سے اقبال کی مراد ایک صاحبِ بصیرت انسان ہے

کیونکہ ایک عام آدمی کو کسی منظر کی دلکشی اِس انداز سے متاثر نہیں کرتی جس انداز سے کہ وہ ایک صاحب فکر اور حساس انسان کا حصہ ہوتی ہے۔ اُن کے نزدیک ایک صاحب فکر شخص وہی ہوتا ہے جو زندگی کے عام حالات و تجربات سے بھی اسرار حیات و کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے اقبال ندی کے بہتے اور گاہ بہ گاہ سنگ رہ سے بچنے اور ٹکرانے کے عمل کو اس باہمی کشمکش سے مربوط کر دیتے ہیں جو زمانۂ قدیم سے انسانوں کے درمیان چلی آرہی ہے۔ یہاں شاعر "چھیڑتی جا" کہہ کر شخصی رنگ پیدا کر دیا ہے اور اس طرز تخاطب سے پوری نظم میں زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ چونکہ یہ نظم وطن پرستی کے جذبہ کے تحت لکھی گئی ہے اس لئے مبالغہ کا رنگ بھی جگہ جگہ نمایاں ہے مثلاً ع

چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اس نظم کے آخری بند میں اقبال کوہ ہمالہ کی قدامت اور عظمت کو ہندوستان کی قدیم تاریخ سے وابستہ کرتے ہوئے ہندوستان کے ماضی سے متعلق سوال کر بیٹھتے ہیں ؎

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پہ رنگ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

جس شاعری کی ابتدا کوہ ہمالہ ہو اس کی انتہا کے کیا کہنے۔ وہ محاسن جو بعد میں اقبال کے کلام میں ملتے ہیں ان سب کے بیج اسی نظم میں نظر آتے ہیں۔ مذکورہ نظم میں حب وطن کی جو بھینی بھینی خوشبو ہے اس کی مہک اس کے بعد کی نظموں میں بڑھتی ہی جاتی ہے۔

اقبال کو نہ صرف ہندوستان کے کوہ و صحرا سے وابستگی اور انسیت تھی بلکہ انہوں نے ہندوستان کی کئی شخصیات کو بھی نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ جن میں ہر طرح کی شخصیت شامل ہیں۔ ادبی شخصیتوں میں مرزا غالب، داغ، سر سید احمد خاں وغیرہ قابل ذکر وغیرہ ہیں۔ اپنی نظم "مرزا غالب" میں غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اقبال نے چونکہ غالب کے انداز بیان سے استفادہ کیا ہے اور ان کے کلام سے معنوی رنگ میں فیض بھی حاصل کیا ہے۔ اسی لئے انہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ ضمنی طور پر غالب کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ اپنی اس نظم میں اقبال نے غالب کی شاعری پر ایسی جامع تنقید بھی کی ہے کہ اس سے بہتر شاید ہی کسی سے ہو سکے۔ چونکہ غالب کا مدفن دہلی ہے اسی وجہ سے اس نظم کے آخری بند میں دہلی کا مرثیہ کہا ہے۔ دہلی جو کئی بار لٹی ہے۔ کون جانے اس میں کتنے شمس و قمر خوابیدہ ہیں۔ کتنے لعل و گہر مدفون ہیں یعنی غالب جیسی کتنی ہی شخصیات

اس میں محو خواب ہیں۔

اقبال کے پہلے دور کا کلام جوش و اثر اور آہنگ و ترنم سے مالا مال ہے۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں ایک نظم "بچے کی دعا" کے ایک شعر میں شاعر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ جس طرح پھول کی وجہ سے چمن کی زینت بڑھتی ہے اسی طرح اس کے دم سے اس کے وطن کی زینت و آبرو بڑھے ؎

ہو مرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

اقبال کا عہد ہندوستان کی محکومی کا عہد تھا۔ انہوں نے ہندوستانیوں کی اس حالت زار کو بادیدۂ نمناک دیکھا کیونکہ انھیں اس غلامی کا شدید احساس تھا۔ ان کی نظم "پرندے کی فریاد" ان کے اس احساس کی غمازی کرتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے یہ نظم بھی بچوں کے لئے لکھی ہے۔ لیکن اس میں بھی وہ والہانہ جذبہ حب الوطنی موجود ہے جو بعد کی نظموں میں بڑھتا ہی گیا ہے۔ اس کا ڈھانچہ انگریزی نظم سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن نظم کا سارا آب و رنگ شاعر کے اپنے تخیل کی ایجاد ہے۔ اس نظم میں ایک قیدی پرندے کے ان احساسات کو پیش کیا گیا ہے جو عالم اسیری میں ماضی کو یاد کرتا ہے جبکہ وہ آزاد تھا باغ کی بہاریں دیکھ کر اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا۔ اور وہ خوشی، خوشی آزادی

کے ساتھ ایک ڈال سے دوسرے ڈال پر چہچہاتا ہوا اڑتا پھرتا تھا ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

قیدی پرندے کی تمثیل میں اقبال نے دراصل ایک غلام قوم کا حال دل بڑے ہی درد بھرے اور پر اثر انداز میں بیان کیا ہے جس کی حالت اس پرندے کی سی ہے جسے قید کر دیا گیا ہے۔ غلامی کے عہد میں ہر غلام قوم کو وہ تمام نعمتیں ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں جو اسے آزادی کے دور میں حاصل تھیں ـــــ اس نظم میں ہندوستانی قوم کو اقبال ایک قیدی پرندے سے تشبیہ دیتے ہیں جسے ظالم صیاد انگریز قوم نے قید کر کے آزادی کی نعمتوں اور خوشیوں سے محروم کر دیا ہے۔ پھر اقبال اپنا تقابل ان آزاد قوموں سے کرتے ہیں جنہیں آزادی کی وجہ سے زندگی کی تمام نعمتیں میسر ہیں ؎

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

اس بند کے آخری شعر میں شاعر کے اس غمگین دل کی کیفیات ظاہر ہوتی ہیں جس کا غم غلامی کی وجہ سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ نظم ۱۹۰۵ء میں "مخزن" میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اشاعت کے ساتھ ہی یہ بہت مقبول ہوئی اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی علامت بن گئی ـــــ اور ساتھ ہی بچوں کے درسی کتب میں شامل کی گئی۔ اس میں وہ رجحان ملتا ہے جو تحریک آزادی کے ابتدائی دور کا غماز ہے یعنی دعاؤں التجاؤں اور احتجاج کے دور کا۔

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

اس زمانے میں ہندوستانی آپس میں دست و گریباں تھے۔ تقسیم بنگال کے مسئلے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ کر دیئے تھے۔ سامراجی حکمت عملی سے بھی ہندوستان کی فضاء اس نفاق سے آلودہ

ہو رہی تھی جو دن بہ دن ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کے رجحان کو بڑھا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اقبالؔ کے غم ناآشنا دل سے صدائے درد بے اختیار نکل پڑتی ہے۔ اپنی نظم "صدائے درد" میں اقبالؔ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر اس نفاق انگیز فضاء کا تدارک نہ کیا جائے تو وہ ہندوستان کی وطنیت کے تصور کو متاثر کرے گی۔ یہ نظم ۱۹۰۲ء میں "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کے ہندوستان کی تاریخ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس میں شاعر درد دل سے چیخ اٹھتا ہے اور اپنے ملک کی بدنصیبی پہ آنسو بہاتا ہے ؎

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

یہاں شاعر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی خرمن کے دانوں سے تعبیر کیا ہے اور ان کے اختلافات پہ بے انتہا افسوس کیا ہے۔ اقبالؔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے اس ظاہری اتحاد سے بھی بیزار تھے جس کی نوعیت "اختلاط موجہ و ساحل" کی سی تھی کیونکہ وہ

تو لذت قرب حقیقی کے قائل تھے سہ

لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاف موجۂ و ساحل سے ٹکراتا ہوں میں

اقبال نے پوری نظم میں ان تمام نزاعات کی مذمت کی ہے جن سے ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں میں تفرقہ کو تقویت پہونچی ہے۔ عزیز احمد اس نظم کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔

"اسی نظم صدائے درد" میں پہلی مرتبہ ہندوستان کی نا اتفاقی سے گریز اور علیحدہ اسلامی مرکز کی تلاش کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ لیکن یہ اشارہ محض مایوسی کی ایک گزرتی ہوئی کیفیت ہے اور پاکستان کی تخلیق سے اقبال کا ذہن ابھی ایک چوتھائی صدی پیچھے تھا[1]"

اقبال کی ایک نظم " سید کی لوح تربت " بھی جذبۂ حب الوطنی کی حامل ہے۔ وہ مذہب کو سیاست سے الگ دیکھنا چاہتے تھے۔

یہی پیغام اس نظم میں نظر آتا ہے۔ یہ نظم سرسید سے متعلق ہے

[1] اقبال نئی تشکیل از عزیز احمد

اقبال نے سرسید کی زندگی اور اصلاحی کاموں سے جو اثر قبول کیا اس کو سرسید
کی لوح تربت کی زبان سے اس نظم میں بیان کیا ہے ؎

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زبان
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں

اس نظم میں وطنیت کے تصور یکجہتی کے علاوہ بہت سی انقلابی اور اخلاقی
قدریں بھی پیش کی گئی ہیں جو لبعد کے دور کے کلام میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔
اسی نظم میں اقبال نے پہلی مرتبہ اس امر پہ زور دیا ہے کہ تعلیم دین کا مقصد
رہبانیت نہیں ہے بلکہ دنیا اور اس کی قوتوں کی تسخیر ہے ؎

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

نظم "شاعر" بھی اقبال کے قومی جذبات و تصورات کی آئینہ دار
ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ اگر قوم کو جسم قرار دیا جائے تو افراد
اس کے اعضاء ہیں حکومت اس کا چہرہ اور شاعر اس کی آنکھ ہے جس
طرح آنکھ سارے جسم کی ہمدرد ہوتی ہے اسی طرح شاعر کے دل میں
قوم کے تمام افراد کی محبت و ہمدردی جاگزیں ہوتی ہے۔ یہ چیز
خود اقبال پہ صادق آتی ہے۔ فارسی کے ایک شعر میں اقبال شاعر کو قوم
کا دل کہتے ہیں اور اس کی اہمیت اور مقام کو اس طرح واضح کرتے
ہیں ؎

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملتے بے شاعرے انبار گل

اقبال کے خیال کے مطابق شاعر ایک ایسی ہستی ہے جس کا شعور عوام سے بلند ہوتا ہے۔ وہ اسی بلندی سے پکارتا ہے اور دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے جس سے قوم کا ذہنی افق بام عروج پر پہونچ سکے۔ اس مقصد کے لئے اقبال قوم اور معماران قوم کی ان کمزوریوں کو بھی نشانہ بناتے ہیں جو قوم کے ارتقاء کے لئے مضر ہوتی ہیں ؎

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کرتا ہے کار تریاقی
عزیز تر ہے متاع امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی سا سوز براقی

اقبال نے قوم کو ایک دعوتِ فکر دی۔ قوم کی ان دکھتی رگوں کو چھیڑا جو قوم کے اتحاد و اتفاق اور ارتقاء کے لئے ناسور بن رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی قومی شاعری کے ذریعہ مذہبی، نسلی اور علاقائی تنگ نظری کے خلاف آواز اٹھائی اور منزل مقصود کی طرف رہنمائی فرمائی۔

اسی دور کی ایک عہد آفریں نظم "تصویر درد" ہے جو ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہ نظم حبِ وطن، آزادیٔ وطن، یہ یادیٔ وطن،

فکرِ وطن، اہلِ وطن غرض صرف وطن سے متعلق ہے۔ اس دلکش نظم کو اقبال نے ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب علامہ سر محمد اقبال پر وطن دوستی کا رنگ غالب تھا۔ ولایت جانے سے قبل اقبال نے جو پانچ طویل نظمیں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھیں انھیں میں سے ایک "تصویرِ درد" بھی ہے جسے رسالہ "مخزن" نے مارچ ۱۹۰۴ء کی اشاعت کے ساتھ بطور ضمیمہ چھاپا۔ نظم کے ابتدائی دو بند تمہیدی ہیں تیسرے بند سے اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس نظم میں اقبال ایک وطن پرور (NATIONALIST) کی شکل میں قوم کے سامنے آتے ہیں جو رنگ "ہمالہ" "نیا شوالہ" اور "ترانہ ہندی" میں پایا جاتا ہے وہی رنگ پوری شدت کے ساتھ اس نظم میں نظر آتا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح سامراجی طاقتیں اپنی قوت کو جاری رکھنے کے لئے اپنے محکوموں کے درمیان آپسی نفاق کا بیج بو کر ان کا استحصال کرتی ہیں۔ اس میں ہندوستانی قوموں کے باہمی نفاق کا تذکرہ بڑا ہی دل اندوز ہے۔ بدقسمت وطن کی حالتِ زار شاعر کو اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ وہ بے چینی و بے بسی کے عالم میں اس طرح نوحہ خوانی کرنے لگتا ہے ؎

رُلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

اسی نظم میں اقبال نے اہل وطن کو صاف لفظوں میں متنبہ کیا ہے کہ اگر تم نے آنے والی مصیبت کا اندازہ کر کے آپس میں اتحاد نہ کیا تو تم مٹ جاؤ گے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس نظم میں ایک سچے محب وطن کی مضطرب روح آہ و فغاں کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے دل دوز نغمے ہر محب وطن کے لئے ایک عمومی اپیل رکھتے ہیں مولوی عبدالحق اس نظم کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔

"تصویر درد" درحقیقت بے مثل اور سراپا درد ہے اور شاعر نے دل کھول کر اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے۔[1]

اقبال کہتے ہیں کہ ماضی کی تلخ حقیقتوں کو بھلا کر قوموں کو چاہئے کہ اپنے قدیم اور مشترکہ ترکہ یعنی وطن کی طرف متوجہ ہوں۔

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو
میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

تمیز ملت و آئین ہی قوموں کے درمیان تفرقہ اور تعصب کے رجحانات

---

[1] اقبال اور عبدالحق از ممتاز حسن

پیدا کرتی ہے جس سے متحدہ قومیت اور وطنیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔
اس لئے اقبال قوم کو اس خطرے سے ان الفاظ میں آگاہ کرتے ہیں

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

اقبال کے نزدیک اس خطرے کا واحد علاج یہی ہے کہ قوم متعصبانہ جذبات کو روکنے کی کوشش کرے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہر ممکنہ سعی کرے ؎

تعصب چھوڑ ناداں! دہر ‌کیا ہے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

اور پھر وہ معاشی مذہبی اور سیاسی افتراق کا علاج باہمی قربت میں ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے خیال میں اتفاق ہی اس سارے سیاسی مرض کا علاج ہے جس سے نہ صرف جذبہ وطنیت ہی کی تسکین ہوتی ہے بلکہ دوسری قول کا اس طرح باہمی اتحاد دراصل ایک عالمگیر انسانی اتحاد کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے اقبال اس اتفاق کی بنیاد ہی نوع انسان کی محبت پر رکھتے ہوئے کہتے ہیں ؎

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

اسی محبت کو اقبال اگلے بند میں ایک طرح کے سیاسی تصوف میں حل

کر دیتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی یہ محبت رفتہ رفتہ خالص محبت اور مقصود بالذات محبت بن جاتی ہے جو اقبال کے نزدیک تاریخ کی تمام غلط کاریوں کا علاج ہے۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

یہ جذبہ محبت ایسا ہمہ گیر اور آفاقی نوعیت کا ہوتا ہے کہ یہ انسان کے سیاسی اور ذہنی تصورات پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ اقبال غلامی کا اصل سبب باہمی تفرقہ کو بتاتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس تفرقہ ہی سے سامراج کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں جبکہ محبت اس نفاق اور غلامی کی زنجیروں کو توڑتی ہے۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

اس نظم میں اقبال نے محبت کے آفاقی تصور کے علاوہ اپنا فلسفہ حرکت وعمل بھی پیش کیا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حرکت وعمل سے ہی انسان اپنی قوم کو خوش حال بنانے اور اسے بام عروج پہ پہونچانے کے لئے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے۔

اقبال کی نظم "ترانۂ ہندی" کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو شاید ہی کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو۔ قومی گیت کی حیثیت سے بھی اسے

خاص اہمیت حاصل ہے اور اسی حیثیت سے یہ چھوٹے بڑے عام و خاص عالم و جاہل سب کی زبانوں پر جاری ہے۔ یہ ترانہ اقبال نے ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا۔ ان کی یہ نظم ان کی حب الوطنی کی آئینہ دار ہے۔ اس میں مقصدیت اور شعریت کی حدیں ملتی ہیں۔ اس شعر میں اقبال نے ہندوستان کو سارے جہاں سے اچھا مانا ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس نظم میں اقبال کے جغرافیائی وطنیت کے جذبہ کی شدت اور والہانہ محبت کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اقبال کا یہ قومی ترانہ ہندوستانی زبانوں کی قومی شاعری کے اعلیٰ ترین نمونوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے متعدد شاعروں اور ادیبوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں خواہ وہ بنگالی ہو یا مراٹھی۔ گجراتی ہو یا ہندی اس درجہ کا شدید قومی احساس نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ بجائے کسی اور زبان کے اردو زبان میں نظم کیا ہوا اقبال کا یہ قومی ترانہ جدوجہد آزادی کے طویل عرصہ میں آزادی کے سرفروشوں اور متوالوں کے دلوں کو گرماتا رہا۔ جغرافیائی حب الوطنی کا جذبہ جب اقبال کے دل میں شدت

اختیار کرتا ہے وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں ؎

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

ہندوستان سے اقبال کی یہی وابستگی تھی جس کی بنا پر وہ اس نظم میں کسی اور ندی کا ذکر کرنے کے بجائے آبِ رودِ گنگا سے مخاطب ہیں۔ کیونکہ اسی ندی سے ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایات وابستہ ہیں ؎

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اقبال کا عقیدہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ ہونا چاہیئے اور قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ وطن پر ہونی چاہیئے۔ ان کا یہ واثق عقیدہ مذکورہ نظم میں نمایاں ہے ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس نظم میں شاعر کے دل سے حبِ وطن کے شعلے اٹھتے اور ہر دردمند دل کو گرماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حب الوطنی کے جذبہ کی وجہ سے اس میں سوز و گداز کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے خصوصاً آخری مصرعہ ع

معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

یہاں لفظ "کسی" نے سوز و گداز کی کیفیت میں کافی اضافہ کر دیا۔

"ترانہ ہندی" کے بعد جو قومی نظم ملتی ہے وہ "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہے۔ یہ دراصل وطن کی محبت کا راگ ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ ہندوستان میں بہت سے فرقے اور مذاہب ہیں اور یہ سب ملک کی تمدنی وحدت میں انتشار پیدا نہیں کرتے بلکہ رنگا رنگی پیدا کرتے ہیں ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یہ نظم اس سرزمین سے متعلق ہے جہاں سے دنیا نے وحدت کی لئے سنی تھی اور سرور کائنات رسول مقبولؐ کو ٹھنڈی ہوا آئی تھی ؎

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

اقبال کو ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی اسی وجہ سے انہوں نے حضرت نوحؑ کی کشتی کو بھی کوہ ہمالہ پر ہی لا ٹھیرایا ہے ؎

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبیؑ کا ٹھیرا آکر جہاں سفینا

اقبال کی نظم "نیا شوالہ" جو حب الوطنی کے جذبات سے پُر ہے اسی دور سے متعلق ہے۔ ان کی قومی شاعری کا سب سے بڑا محرک جذبہ اور سب سے اہم موضوع "اتفاق" ہے اور "نیا شوالہ" اتفاق کے موضوع پر ان کی بہترین اور دلکش ترین نظم ہے۔ اقبال کی قومی شاعری کا نقطۂ عروج اسی نظم میں ملتا ہے۔ کیونکہ اسی نظم میں انہوں نے ہندوستانی سیاست کا یک قومی نظریہ کا تصور پیش کیا ہے جو اُس زمانے کی سیاست میں ایک اچھوتا خیال تھا جس کو آگے چل کر انڈین نیشنل کانگریس کے صاحب فکر رہنماؤں نے آگے بڑھایا جن میں خصوصیت کے ساتھ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو قابل ذکر ہیں۔ یہ نظم اقبال کے پہلے دور کی تمام نظموں سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں نادر تشبیہات پُرخلوص اور پُرجوش انوکھا موثر اور دلکش انداز بیان پایا جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو صرف کرتے ہوئے وطن کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ پوری نظم انھیں جذبات کی مظہر ہے جن سے وطن پرستی کی ترغیب ملتی ہے اور تنگ نظری کی تردید ہوتی ہے اس نظم کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شاعر کے انتہائے کمال کا نمونہ ہے۔

یوں تو اقبال نے ہندو مسلم اتحاد اور حب وطن کے موضوع پر متعدد نظمیں لکھی ہیں لیکن "نیا شوالہ" ان تمام نظموں میں بھی علیحدہ اور ممتاز

مقام رکھتی ہے۔ وہ چیز جو اس کو تمام نظموں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی زبان ہے۔ اقبال نے ہندو مسلم اتحاد کے موضوع کے لحاظ سے ہندی الفاظ جس خوش اسلوبی، برجستہ اور بے تکلفانہ انداز سے استعمال کئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ اس نظم کا موضوع ہندو مسلم اتحاد کی تلقین ہے اس لئے اقبال نے ہندوستان میں بسنے والے ایک اہم طبقے کے نمائندے برہمن کو خطاب کرتے ہوئے دراصل تمام ہندوستانیوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ اقبال کے نزدیک ہندوستانیوں کے فرقہ وارانہ اور طبقہ واری اختلافات اس روشن خیالی کے دور میں اس قدر پوشیدہ ہو گئے ہیں کہ انھیں مزیدیت بناکر پوجنا دانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ جب ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے خلاف نفرت کے جذبات کی نشو نما کرتا ہے تو اس کے ردعمل کے طور پر دوسرے طبقہ میں بھی اس قسم کے احساسات پیدا ہوتے ہیں جس کا نتیجہ سوائے جنگ و جدل کے اور کچھ نہیں ؎

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

اور ان کے اس طرزِ عمل سے عہدِ نو کی وہ روشن خیال نسل بھی بیزار ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ کی غلط کاریوں اور فرقہ وارانہ خیالات کو دور کر کے امن و بھائی چارگی کی فضاء پیدا کریں۔ اِس نظم میں اقبال کا وہ آفاقی

تصورِ محبت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے جو محض ان کی قومی شاعری کی خصوصیت نہیں بلکہ آگے چل کر یہ پیامِ اقبال کا ایک جز لاینفک بن جاتا ہے ؎

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
بھگتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مذکورہ اشعار سے کبیر اور بھگتی تحریک کی کوشش اتحاد کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ اس پوری نظم پر کبیر اور بھگتی تحریک کا اثر نمایاں ہے خصوصاً ان متروک اشعار میں جن کا ذکر عزیز احمد نے اپنی کتاب "اقبال نئی تشکیل" میں کیا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں

عزیز احمد[1] نے اس پوری نظم پر بھگتی تحریک کے نمایاں اثر کا اعتراف کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آخری شعر زیرِ بحث بندوں کی پامالی یا سکل نہیں کرتا کیونکہ بھگتی تحریک بنیادی طور پر دو حصوں

---

[1] "اقبال نئی تشکیل" از عزیز احمد

میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن بھگتی تحریک کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ان کو ہم بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو معبود حقیقی کا تصور کسی مادی پیکر کی شکل میں نہیں کرتے اور اسے ایک نور مجسم قرار دیتے ہیں جس کی کوئی شکل و صورت نہیں۔ انھیں ہندی میں نرگن وار کا فلسفہ قرار دیا گیا... دوسرا سلسلہ ان لوگوں کا ہے جو معبود حقیقی کو کسی نہ کسی مادی پیکر میں دیکھتے ہیں۔ اس کی شکلیں اور نام مختلف ہو سکتے ہیں لیکن وہ دراصل اس جلوہ ازل کے مختلف روپ ہیں۔ اس فلسفہ کو ہندی ادب میں سگن واد کا نام دیا گیا ہے[1]۔"

اس اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال اس تحریک کے فکری اور تہذیبی پس منظر سے واقف تھے ۔۔۔ انہوں نے ان دونوں فلسفوں کو باہم مربوط کرکے ایک ایسا مجموعی تاثر قائم کرنے کی کوشش کی جس کی مدد سے ہندستان کے مختلف طبقات کے مابین اتحاد اور یکجہتی کی فضاء پیدا ہو سکے۔

---

[1] ہندی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محمد حسن

دوسرا دور

اقبال کی قومی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے جبکہ انہوں نے حصول اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان کا سفر کیا۔ اقبال کا یہ سفر یورپ ایک صاحب فکر نوجوان کا سفر تھا جس کی بے تاب روح زندگی کی حقیقتوں کو پالینے کے لئے بے چین و مضطرب تھی۔ جب اقبال نے انگلستان کا سفر کیا تو اس وقت ان کی طبیعت اور سیرت میں پختگی آچکی تھی۔ اور وہ ملک کی حالت سے واقف اور زمانے کے تیور پہچان چکے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں دل میں حب وطن کی لو لئے ہوئے اقبال انگلستان پہونچے۔ قیام یورپ کے دوران اقبال کو یورپ کی مختلف قوموں کی باہمی رقابتوں کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس زمانے کے کلام کے پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ نئے مشاہدات اور خیالات نے ان کے دل میں ایک جوشِ تلاطم پیدا کر رکھا تھا۔ ان خیالات کو انہوں نے اپنی نظم "شیخ عبدالقادر" کے نام میں ظاہر کیا ہے۔ جو یورپ میں ان کے ہم سفر اور ہم مشرب تھے۔ اس نظم میں اقبال خود عامل ہونا چاہتے ہیں اور دوسروں کو عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال نے یورپ کے منفی اور مثبت اقدار کا مطالعہ کیا۔ جس سے نظر میں وسعت، فکر میں گہرائی فن میں ہمہ گیری اور جدید و قدیم میں اسلوب ارتباط کا اضافہ ہوا۔ اور ان کی قومیت کا تصور بھی اتنا وسیع ہوگیا کہ لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

انگلستان کے قیام کے اور بعد کے زمانے کے کلام سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں جن سے ان کے خیال میں انقلاب پیدا ہوا۔ ایک تو یہ کہ یورپ کے جدید تمدن کا طلسم ان کی نظروں میں محض مکڑی کے جالے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا جو خود غرضی اور خود پرستی پر مبنی ہے اور بنی نوع انسان کے حق میں مضر ہے۔ مغربی تمدن پر اقبال نے اپنے اشعار میں بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کے یہ اشعار مقبول خاص و عام ہو گئے ہیں سے

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا!

دوسرے وہ یورپ کی وطنیت اور قوم پرستی کے نظریہ سے سخت بیزار ہیں اور ان کی تنگ نظری اور خود غرضی کو دنیا کے لئے مہلک کہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عظیم شاعری ساری انسانیت کے لئے ہوتی ہے۔ چونکہ اقبال ایک عظیم شاعر تھے اس لئے ان کی قومیت کا تصور بھی محدود نہیں رہا بلکہ وہ ساری انسانیت کے لئے ہو گیا سے

حرفِ بد را بہ لب آوردن خطا است
کافر و مومن ہمہ خلق خدا است

اقبال کے کلام میں یہ وسعت اسی لئے پیدا ہوئی کہ اب وہ قومیت و وطنیت کے ساز کو توڑ کر عالمیت اور بین الاقوامیت کے نغمے سنانے لگے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کی آنکھوں پر وطنی تعصب کی پٹی بندھی رہے۔۔۔۔ ذہنی سفر کے کسی دور میں بھی اقبال حب الوطنی یا ارضِ ہند کی محبت سے بیگانہ نہیں رہے۔ ان کے افکار میں وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"حبِ وطن اور وطن سے والہانہ وابستگی کے نقوش اقبال کی شاعری کے ہر دور میں ملتے ہیں لیکن اب وہ حبِ وطن کے جذبہ کو ایک وسیع تر پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ یہ ایک عظیم عالمی مفکر کا نقطۂ نظر ہے جو ساری نوعِ انسانی کے عظیم مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔ وطن سے محبت بھی، اس کے دل میں اپنی جگہ اور اپنا مقام رکھتی ہے بالکل اسی طرح جیسے والدین سے محبت، اور زن و فرزند سے محبت کا جذبہ لیکن یہ جذبہ، ساری نوعِ انسانی سے اس کی محبت کے جذبے

سے متصادم نہیں ہوتا اور نہ اس کی راہ میں حائل ہوسکتا ہے۔[۱]"

اقبال کے ہاں وطنیت کا وہ مفہوم نہیں جو عام طور پر مستعمل ہے۔ ان کے ہاں وطن اور متوطن کی حیثیت زمین اور درخت کی نہیں۔ درخت زمین میں پیوست رہتا ہے اور زمین ہی کو فائدہ پہونچاتا ہے اور زمین ہی کا ہوکر رہتا ہے۔ اقبال کے ہاں وطن اور متوطن کی حیثیت مشرق اور آفتاب کی ہے۔ آفتاب کسی مقام، سمت یا جہت کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ پورے عالم کو منور کرتا ہے۔ اگرچہ وہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے ؎

گرچہ از مشرق برآید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب

"اتفاق" جیسا کہ پچھلے اوراق میں ذکر کیا گیا ہے اقبال کی قومی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ اِس اتفاق کی اصلی بنیاد نوع انسان کی محبت پر ہے اور اس موضوع پر اقبال نے متعدد اشعار نظم کئے ہیں۔ بنی نوع انسان سے ان کی یہ شیفتگی، محبت اور احساس اخوت نے ان سے وہ نظمیں کہلائیں جو قوم پرستی کا رد ہیں۔ لیکن جذبہ وطن دوستی کی ضد نہیں۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن

---

[۱] مادر ہند اور اقبالؒ از ڈاکٹر غلام عمر خاں

اس حقیقت کا سب سے موثر اور دلکش اظہار "ضرب کلیم" کی ایک مشہور نظم "شعاع امید" میں ہوا ہے۔ یہ دراصل فنون لطیفہ میں زندگی کا ایک نیا پیغام اور ایک نئی امید ہے۔ اس شعاع کا رخ ہندوستان کی جانب ہے۔ مثلاً دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

اقبال نے اپنی شاعری میں بلا قید مذہب و ملت ہندوستان کی عظیم المرتبت شخصیتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانی اقدار کے حامل تھے ؎

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

ان عظیم شخصیتوں میں سوامی رام تیرتھ، مہاتما بدھ، راجہ چندر جی، گرو نانک، وشوامیتر یا (شیواجی مہاراج) بھرتری ہری، غنی کاشمیری، غلام قادر روہیلہ اور ٹیپو سلطان کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ہندوستانی قومی پس منظر سے اقبال کی گہری وابستگی ان کی نظم "سوامی رام تیرتھ" سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نظم میں اقبال نے سوامی رام تیرتھ

کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ سوامی جی کو قطرۂ بے تاب کہتے ہیں کیونکہ رام تیرتھ ہر وقت خدا کو جاننے کے لئے بے چین و بے قرار رہتے تھے۔ یہاں اقبال کا فلسفہ حرکت و عمل ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر انسان حرکت و عمل اور جد و جہد کرے تو اس کی قوم ترقی کر سکتی ہے حتیٰ کہ وہ خدا کو بھی پا سکتا ہے۔ یعنی اسی جد و جہد سے وہ اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے۔ اپنی منزل کو پانے کے لئے انسان کو چاہیئے کہ اس سعی مسلسل میں اپنے آپ کو فنا بھی کرنا پڑے تو بخوشی تیار ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

اسی طرح نظم "رام" میں اقبال رامچندر جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ رامچندر جی ہندوستانی تہذیب کا وہ عظیم نمونہ ہے جن کی شخصیت پاکیزگی، محبت، ایثار اور شجاعت کا ایک حسین امتزاج تھی۔ (JOHN DOWSON) اپنے مقالہ میں رقمطراز ہیں۔

"سنسکرت کی قدیم رزمیہ نظم رامائن میں جو (۵۰۰ ق م)

کی تصنیف ہے شاعر والمیکی نے رام کو ایک ایسے
مثالی کردار کے روپ میں پیش کیا ہے جس کی
عظمت، بہادری، ایثار اور اخلاق کا ہر ایک
قائل تھا۔[1]

جبکہ رام کی عظمت اور بہادری کا ہر ایک قائل تھا تو اقبال جیسے قومی شاعر اور مفکر اعظم رام کی عظمت سے کیسے انکار کر سکتے تھے رامچندر جی سے اقبال کی عقیدت بلکہ والہانہ عقیدت کا یہ عالم کہ وہ ان کو "امام ہند" اور "چراغ ہدایت" قرار دیتے ہیں۔ وہ رام کو ہندوستانی تہذیب کے ایک عظیم انسانی نمونے کی حیثیت سے سرزمین ہند کے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک رام کی شخصیت ہندوستان کے لئے مایہ ناز ہے۔ ان کا یہ طرز فکر ان کی ہندوستانی تمدن سے گہری وابستگی اور ان کی بے تعصبی اور یکجہتی پسند مزاج کا آئینہ دار ہے۔ اقبال کی وسیع النظری اور بے تعصبی کو بیان کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:۔

"اقبال نہایت فراخ دلی اور وسیع المشربی سے

---

[1] "A CLASSICAL DICTIONARY OF HINDU MYTHOLOGY AND RELIGION" BY JOHN DOWSON

اس کا اقرار کرتا ہے۔ اس کا دل نہ ہندوستان
سے برداشتہ ہے اور نہ وہ ہندو قوم سے نفرت
کرتا یا اس کی تحقیر کرتا ہے[1]۔

اقبال کا یہ انداز فکر کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں کہ انہوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت تمام مذاہب کے عظیم انسانوں کے عظیم اور قابل تعریف کارناموں کو اپنی شاعری میں سراہا ہے۔ دوسری ملتوں کے مذہبی رہنماؤں کی تذلیل کرنا اور متعصبانہ ملت پرستی کے سبب ان کے اہم کارناموں کو نظرانداز اور پردہ پوش کر دینا انھیں پسند نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دوسری ملتوں کے دینی اور تہذیبی کارناموں کی بھی داد دی ہے۔ نظم "رام" میں انہوں نے سرزمین ہند کی عظیم المرتبت شخصیت کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے ؎

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

ہندوستان کا ایک اور اعلیٰ الشانی نمونہ گرو نانک کی شخصیت ہے جس کی "اتحادِ مذاہب تحریک" نے ہندوستانی تہذیب اور اقبال کے افکار پر گہرے نقوش ثبت کئے ——— چونکہ گرو نانک کا پیام ہندوستانی تمدن

---

[1] فکر اقبال :- از خلیفہ عبدالحکیم

اور قومی مزاج سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہے اس لئے ان کا یہ مشن ہندستانی تہذیب کی تاریخ میں ایک خوشگوار موڑ ثابت ہوا۔ اقبال کی نظم "نانک" اسی موڑ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس نظم میں گرونانک کے بارے میں "اقبال" کے جذبات اور خیالات قابل تحسین ہیں ؂

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

یہاں اقبال گرونانک کو "مردِ کامل" سے موسوم کرتے ہیں اور وہ اس بات سے خوش ہیں کہ گرونانک نے اپنی تبلیغ کے ذریعہ اہل ہند کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اور خود اقبال کی قومی شاعری کا مقصد بھی اہل ہند کو خواب غفلت سے بیدار کرکے انہیں حرکت و جدوجہد اور سعی مسلسل کی تلقین کرنا تھا۔

اقبال نے بدھ مت کے زوال کو اہل ہند کی لاپرواہی اور ناقدری کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اسی نظم میں مہاتما بدھ کی تعلیمات کے اس پہلو کو آشکار کرتے ہیں جو ذات پات کے عقیدے کی نفی کرتا ہے ؂

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی!
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں

اقبال کی قدیم ہندوستان سے روحانی دلچسپی اور وابستگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے گوتم بدھ کے افکار عالیہ کو ایک سے زاید مقامات پر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ "جاوید نامہ" میں پیغام گوتم بدھ پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے ؎

ہر چہ از محکم و پایندہ شناس گذرد
کوہ و صحرا و بحر و کراں چیزے نیست

ہندوستان کے ایک مقبول ممتاز اور منفرد شاعر بھرتری ہری سے بھی اقبال متاثر تھے "بھرتری ہری" سے اقبال کی فطری عقیدت کا واضح اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مجموعہ کلام "بال جبریل" کا آغاز "بھرتری ہری" کے ایک شعر کے اس منظوم ترجمہ سے کیا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اقبال نے اپنے مجموعہ کلام "جاوید نامہ" میں والئ میسور ٹیپو سلطان کو ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے یاد کرتے ہوئے تاریخ عالم کی عظیم شخصیتوں میں ان کا شمار کیا ہے۔ اور اسی نظم میں ٹیپو سلطان کے بے مثل جذبہ حریت اور وطن دوستی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مذکورہ نظم میں اقبال نے ٹیپو سلطان

کی باز آفرینی اور پھر اپنے جواب کی صورت میں جس سوز و درد مندی سے ہندوستان کے روحانی زوال اور عہد غلامی پر تبصرہ کیا ہے۔ اس میں خود اقبال کے حقیقی جذبات کی جھلک ملتی ہے۔ "جاوید نامہ" کی نظم کے علاوہ اقبال نے ایک اردو نظم میں بھی ٹیپو سلطان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

"جاوید نامہ" میں اقبال جعفر و صادق کو وطن اور آزادیٔ وطن سے غداری کے جرم میں ایک لرزا دینے والے عذاب میں مبتلا دکھاتے ہیں جنھیں جہنم کی آگ بھی جلانے سے انکار کر دیتی ہے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ آدم ننگ دیں، ننگ وطن

اقبال کی تصنیف "پیام مشرق" نہ صرف کشمیر اور "غنی کاشمیری" کے ذکر سے لبریز ہے بلکہ اس میں ہندوستان کی غلامی پر بھی بہت سے اشعار ملتے ہیں جو اقبال کے جذبہ حب الوطنی کے مظہر ہیں۔ "ضرب کلیم" کی مختصر سی نظم "گلہ" کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

یہ مجموعہ اقبال کی وفات سے دو سال قبل شائع ہوا تھا۔ مذکورہ نظم میں انہوں نے ہندوستانی قوم کو خطاب کرتے ہوئے ذلت آمیز غلامی

پر رضامند رہنے پر اس کی غیرت کو بڑے ہی موثر انداز میں للکارا ہے۔

"ارمغان حجاز" اقبال کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعہ کلام کی ایک رباعی میں انہوں نے اپنے فلسفیانہ افکار کی روشنی میں مغربی تہذیب کی تقلید کو ہندستانیوں کی غلامی کا اصل سبب قرار دیا ہے۔ اس کتاب کی رباعیات میں اخوت انسانی کا ایک لامتناہی جذبہ جاری وساری نظر آتا ہے۔ عالمگیر محبت کا یہ جذبہ حب وطن کے کیف و سر مستی سے لبریز ہے۔ ہندوستان کی غلامی نے اقبال کو ہمیشہ پریشان رکھا۔ آزادی کا باب غلامی کی تفسیر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان کی شاعری میں حتیٰ کہ اس آخری تصنیف میں بھی غلاموں کے رویوں، ان کے اعمال، ان کے خیالات اور غلامی کی نفسیات کے بارے میں جابجا اشارے ملتے ہیں۔ غرض اقبال کی تمام تصانیف میں ان کی شاعری کسی نہ کسی طرح سے ہندوستانیت کی خوشبو سے مہکتی اور مہکاتی رہی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں متعدد مقامات پر اپنے ہندی ہونے پر فخر کیا ہے۔ اقبال نے زندگی کا اصل محرک جذبہ خودی کو قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ کسی قوم کی تاریخ ہی اس کی اجتماعی خودی کو برقرار رکھنے کا وسیلہ ہو سکتی ہے۔ وہ اقوام میں الاکس کی سی آب دار اور زبردست خودی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک قوموں کا بننا اور بگڑنا، ابھرنا، اور ڈوبنا، افراد کا جماعت اور جماعت کا فرد میں مدغم ہو جانا خودی کے اعتراف یا انکار میں مضمر ہے۔

اس دور میں قوم پرستی کے جذبات نہیں بلکہ وطن دوستی اور بین الاقوامی سماج کا تصور نمایاں نظر آتا ہے۔ اقبال جب ۱۹۰۸ء میں یورپ سے لوٹے تو قوم پرستی کے محدود نظریہ سے بیزار ہو چکے تھے۔ ان کا ذہن تمام عالم کی دوستی اور بھائی چارگی پہ کام کر رہا تھا جس میں ساری کائنات کے تمام انسانوں کو خواہ وہ کسی جغرافیائی خطے سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی نسل یا طبقہ سے متعلق ہوں سب کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع فراہم ہوں۔ قیام یورپ کے دوران سے ہی ان کے ارتقاء نمایاں طور پہ نظر آتا ہے۔ اقبال کے خیالات میں یہ انقلاب ایک بین حقیقت ہے جو ان کے اردو اور فارسی کلام اور اردو اور انگریزی نثر میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ اقبال کے افکار کی وسعت اور خیالات کے ارتقاء اور انقلاب کی بناء پر ان کے بعض نقاد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبال اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں وطن پرست اور وطن دوست شاعر تھے اور ۱۹۰۵ء کے بعد اخوت انسانی کے اصول پر مبنی ایک بین الاقوامی سماج کے تصور کے ساتھ ہی اقبال کی وطن دوستی اور ان کا جذبہ حب وطن ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن خلوص دل اور وسیع النظری سے فکر اقبال کا جائزہ لیا جائے تو اقبال جیسے وسیع التعلیم مفکر پر یہ ایک اتہام ہے۔ شاعری کے ہر دور میں ان کا کلام خاک وطن سے ان کی عمیق محبت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اقبال کے ہمہ گیر اسلامی نظریہ حیات کے

پیش نظر ان پر لگائے جانے والے فرقہ پرستی کے الزام کو رد کرتے ہوئے محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے
ایک انگریزی کتابچہ BHAKTI CULT AND URDU POET میں تحریر فرماتی ہیں۔

" LAST BUT NOT LEAST OF THE CA-
RVAN OF THE URDU POETS IS IQ-
BAL, WHOM SOME CRITICS CONDEMN
FOR BEING A COMMUNALIST. IT IS
SAID THAT TAGORE IMBIBED THE
INDIAN SPIRIT OF SYNCRETISIM"
WHEREAS IQBAL TRIED TO PURIFY
ISLAM FROM INDIAN INFLUEN-
CE, BUT IT IS NOT TRUE IQBAL
WAS A GREAT LOVER OF INDIAN
THOUGHT AND SPIRIT. HE EXTOLL-
ED THE INDIAN HEROES LIKE
SREE RAMACHANDRA AND SHRI
KRISHNA. ACCORDING TO IQBAL,
LOVE IS THE GREATEST

FORCE IN HUMAN LIFE. IN HIS FAMOUS POEM "TARANA" HE WRITES,

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

WE ARE ALL INDIAN AND INDIA IS OUR NATIVE LAND, AT. ANOTHER PLACE HE WRITES,

شہید محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی

loves martyrs of no
one communion are
counted[1]

اس طرح اقبال اپنے ابتدائی دور کی شاعری میں یقیناً ایک قوم
پرست شاعر تھے۔ اور اس دور میں انہوں نے انگریزی سامراج کے خلاف
ہندوستانی قوم کو بیدار کرنے کے لئے اس نظریہ کا سہارا لیا اور قوم کے افراد
میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی تلقین کی۔ ابتدائی دور کی تمام نظمیں
ان کی قوم پرستی کے جذبہ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اقبال پر قوم پرستی کے محدود
نظریہ کی حقیقت اس وقت آشکار ہوئی جب وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض
سے یورپ پہونچے۔ یورپ میں انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی اور دوسرے
ممالک میں بھی انھیں قیام پذیر ہونے کا موقع ملا۔ اس دوران انہوں نے
دیکھا کہ یورپ میں بسنے والی یہ چھوٹی چھوٹی قومیں جو اپنے تہذیب و تمدن
کے اعتبار سے بڑی حد تک ایک ہی قسم کی طرز زندگی کی عادی ہیں لیکن
جس نظریہ حیات نے انھیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا وہ قوم پرستی کا
نظریہ ہے۔ ہندوستان میں رہ کر قوم پرستی کے نظریہ کی حقیقت کو سمجھنا اتنا

---

[1] BhaKti CULT AND URdu POETRY

BY DR. RAFIA SULTANA

آسان نہ تھا لیکن یورپ میں اقبال نے اس نظریہ کے پورے پورے اثرات کا مشاہدہ کیا۔ اس کے بعد اقبال مستقل طور پر قوم پرستی کے مہلک نتایج کے خلاف تلقین وتبلیغ کرنے لگے۔ اور آخر وقت تک وہ اس مہلک نظریہ کے اثرات کو بے نقاب کرتے رہے۔ چنانچہ ان کے پہلے مجموعہ کلام "بانگ درا" میں شامل ایک نظم "وطنیت" ان کے اس رجحان کی غمازی کرتی ہے ؎

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وطن دوستی، وطن کی محبت کا فطری جذبہ ہے جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے لیکن اقبال میں یہ جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا اور اس کی ترجمانی ان کے کلام میں ابتدا تا انتہا پائی جاتی ہے۔ اقبال کا سفر یورپ ان کے افکار میں تبدیلی کا باعث بنا۔ اسی سفر کی وجہ سے ان کی قومی شاعری دو ادوار میں منقسم ہو گئی ہے۔ بقول اقبال۔

"اصل شاعری روح کی شاعری ہے اور وہ
ساری دنیا کے لئے ہوتی ہے۔"

ان کا یہ قول خود انھیں پر صادق آتا ہے کیونکہ ان کے دوسرے دور کی شاعری میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی کہ وہ ساری دنیا کے لئے مشعل راہ بن گئی۔ ان کا مخاطب دنیا کا ہر فرد بشر ہے ہر وہ شخص ہے جو سینے میں ایک مضطرب دل، ایک بے قرار آرزو رکھتا ہے، جو جستجو حقیقت میں سرگرم عمل رہ کر اپنی زندگی کو حیات تازہ بخشنے کا متمنی ہو۔ اور وہ ہر اس قوم سے مخاطب ہوتے ہیں جو دنیا میں اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔

"بانگ درا" کی نظم "پیام عشق" میں اقبال اپنی قوم سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اب وہ زمانہ نہیں کہ عاشق (عاشق وطن) صحرا میں جاکر تنہائی میں زندگی گزارے۔ موجودہ حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ قوم کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کرو اور جس طرح شمع خود فنا ہو جاتی ہے لیکن محفل کو منور کر دیتی ہے۔ اسی طرح تم بھی اے اہل وطن! اپنی زندگی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردو ــــ یاد رکھو افراد کا وجود مجازی ہے یعنی غیر حقیقی ہے اور قوم کا وجود حقیقی یعنی اصلی ہے۔ افراد کی ہستی اور عزت، قوم کی بقا اور عزت پر منحصر ہے اگر قوم کمزور ہوگئی تو افراد کبھی طاقتور نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہر فرد کو لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی قوم کے لئے فنا کردے۔ فرقہ وارانہ خیالات کو دور کرکے قوم کی محبت سے اپنے دلوں کو بھرے۔ اسی نظم کے آخری شعر میں مسلمانوں کو بت پرستی سے دامن بچاکر مدینہ منورہ کی راہ لینے کی تلقین اس طرح کرتے ہیں ؎

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

جس طرح اقبال نے اپنے وطن ہندوستان کی ان معنوں میں پرستش نہیں کی کہ صرف ہندوستان ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہو بالکل اسی طرح اپنے اسلامی فکر کے باعث ایسا بھی نہیں کیا کہ صرف کسی ایک اسلامی ملک یا حجاز ہی کو مرکزِ دل و نگاہ قرار دے دیا ہو۔ ان کے ہاں ایسے متعدد اشعار بھی ملیں گے جن میں انہوں نے علاقائی عدم وابستگی کی تلقین کی ہے ؎

تو ابھی رہ گزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر

"بانگ درا" کی ایک نظم "آفتاب صبح" کے اس شعر سے بھی اقبال کی بے پناہ وسیع النظری عیاں ہوتی ہے جس میں وہ بنی نوع انسان کو اپنی قوم اور ساری کائنات کو اپنا وطن کہتے ہیں ؎

بستۂ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں

مذکورہ شعر میں اقبال نے ساری دنیا کو اپنا وطن کہا ہے لیکن اس کے باوجود خاکِ وطن سے والہانہ وابستگی اور محبت کا اظہار "بلادِ اسلامیہ" میں ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے ہندوستان کو قومیت اسلام کے لئے فارس و شام پر فوقیت دی ہے ؎

ہے اگر قومیت اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

اقبال ایک ایسے مثالی معاشرے کو اہمیت دیتے ہیں جو آج سے چودہ سو سال قبل عرب کے ریگستانوں میں عالم وجود میں آیا تھا جس میں خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروقؓ حبشی غلام حضرت بلال رضی کو "یا سیدی" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اس معاشرے نے کلچر اور تہذیب کے جو معیار پیش کئے تھے وہ اقبال کے نزدیک انسانیت کے اعلیٰ نصب العین کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک جگہ وہ وطن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ؎

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اپنی عمر کے آخری ایام میں بھی اقبال کو اپنے وطن سے جو محبت تھی اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوتا ہے جو انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی سے وطنیت کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے دیا تھا۔

"ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جسکی پرورش کے لئے اثبات کی کچھ ضرورت نہیں۔"

انتخاب کلام

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں! چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں.

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تیری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن تیرا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی
دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تیری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سُنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے — ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے
بدلے یکرنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب — ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں — اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

ملت خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں

حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
ز فیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

ریاضِ دہر میں نا آشنائے بزمِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محرومِ مسرت ہوں

مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

خزینہ ہوں چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں؟

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں!
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

سن اے غافل صدا میری، یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے　　دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر　　زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا　　لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے　　تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا　　چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو　　جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہمنشیں! رہنے دے شغل سینہ کاوی میں　　کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے　　تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے　　گزاری عمر پستی میں مثال نقش پا تو نے

رہا دل بستۂ محفل مگر اپنی نگاہوں کو　　کیا بیرون محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر　　مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں　　یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

سراپا نالۂ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا! سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے
صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں! حنا تو نے
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے!
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل! بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے
کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا ارے غافل! جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پرنم کو جو تڑپاتا ہے پروانے کو رلواتا ہے شبنم کو
نرا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اس کا بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو
اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو
شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو
پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا
شرابِ بے خودی سے تا فلک پرواز ہے میری شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا
تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثل حباب آبجو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیابان محبت دشت غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاج گردش چرخ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بیستوں بھی کوہکن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے؟

سکوت آموز طول داستان درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت!

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبیؑ کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

شعاعِ امید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام — دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام

مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں — بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام

نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت — نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ — چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں — بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن — افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم — لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے

اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳)

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور — آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو — جب تک نہ ہو مشرق کا ہر ذرہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن — یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی — جن کے لیے ہر بحرِ پر آشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

○

کتابیات

نشان سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	سنہ اشاعت	مقام اشاعت
۱	فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۱۹۷۷ء	اسرار کریمی پریس الہ آباد
۲	نخلستان ادب (اقبال نمبر)			
۳	نیرنگ خیال (اقبال نمبر)		ماہ ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء	
۴	روح اقبال	یوسف حسین خاں	۱۹۷۶ء	کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی
۵	اقبال کامل	مولانا عبدالسلام ندوی	۱۹۵۲ء	
۶	اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں	گوپی چند نارنگ (مرتبہ)		جمال پرنٹنگ پریس دہلی
۷	اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	سید معراج نیر	۱۹۷۷ء	جے۔کے آفسٹ پریس جامع مسجد دہلی ۶
۸	تنقید اقبال اور دوسرے مضامین	ڈاکٹر عبدالحق	۱۹۷۶ء	جمال پرنٹنگ پریس دہلی
۹	اقبال اور عبدالحق	ممتاز حسن	۱۹۷۶ء	

۱۰	ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن		
۱۱	سیہ رس (اقبال نمبر)			
۱۲	BHAKTI CULT AND URDU POETS	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ		
۱۳	اقبال اور اس کا عہد	جگن ناتھ آزاد	۱۹۶۴ء	اسرار کریمی پریس الہ آباد
۱۴	A CLASSICAL DICTIONARY OF HINDU MYTHOLOGY AND RELIGION	JOHN DOWSON		
۱۵	نقوش اقبال	مولوی شمس تبریز خاں	۱۹۷۲ء	
۱۶	اقبال نئی تشکیل	عزیز احمد	۱۹۸۰ء	کلر پرنٹنگ پریس دہلی
۱۷	تعلیمات اقبال دیبام حریت	یوسف خاں سلیم چشتی	۱۹۷۴ء	ہندوستانی تصویر پریس دہلی
۱۸	جوہر اقبال	سید محمد حنیف		

۱۹	ترقی پسند ادب	سردار جعفری		
۲۰	دیباچہ بانگ درا	شیخ عبدالقادر		
۲۱	تصورات اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۹۷۴ء	کوہ نور پریس دہلی
۲۲	اقبال شاعر اور فلسفی	سید وقار عظیم	۱۹۷۵ء	اسرار کریمی پریس الہ آباد
۲۳	عرفان اقبال	ڈاکٹر یوسف مہرت		
۲۴	مادر ہند اور اقبال مضمون برائے روزنامہ	ڈاکٹر غلام عمر خاں	۲۷/ڈسمبر ۱۹۸۱ء	
	مصنف			
۲۵	پرتو اقبال	رشید نازکی محمد احسن احسن (مرتبہ)	۱۹۷۸ء	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر
۲۶	اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر	ڈاکٹر تارا چند		